ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

قومی تشخص کی تحریک

ہماری جدوجہدِ آزادی کا آغاز دو سو سال پہلے شاہ ولی اللہ کی تحریک سے ہوا۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں مسلمانوں کے زوال کے یہ اسباب بیان کیے تھے۔

اوّل : دین کو اس کے صحیح تناظر اور صحیح رُوح کے مطابق نہیں سمجھا گیا۔

دوم : خلافت کی جگہ سلطانی کی رسم اختیار کر لی گئی۔

سوم : جاگیرداروں اور امیروں کا ایک ایسا طبقہ اُبھر آیا جو بداخلاقی اور تعیش کی زندگی میں ڈوب گیا۔

چہارم : بیت المال کا بیشتر حصہ ایسے بے شمار افراد پر صرف ہونے لگا جو بغیر کام کیے مملکت پر بوجھ بن گئے۔

پنجم : کاشت کاروں، تاجروں اور پیشہ ور کارکنوں میں اضطراب، جنھیں قریب قریب تمام ٹیکسوں کا بوجھ برداشت کرنا پڑتا تھا۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک اس سنگین صورتِ حال کا علاج یہ تھا کہ اسلام کی اصل رُوح کے مطابق مسلمانوں کی اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا جائے۔ تاکہ اس کے بطن سے ایک مثالی اور عادلانہ معاشرتی نظام جنم لے۔ اس کے لیے پہلا کام یہ تھا کہ قرآنِ حکیم کی تعلیمات کو عام کیا جائے۔ دوسرا کام یہ تھا کہ ایک جماعت بنائی جائے، جو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں انسانوں کو بہتر سوچ اور بہتر کردار کی طرف رغبت دلائے اور جب حالات سازگار ہوں تو مثالی نظام کے نفاذ کے لیے عملی قدم اٹھائے۔ ان دونوں کاموں کے سلسلے میں جو مساعی ہوئیں انہی کا مجموعی نام شاہ ولی اللہ کی تحریک ہے۔ پہلا کام خود شاہ ولی اللہ نے اور ان کی اولاد نے کیا۔ اس زمانے میں قرآنِ حکیم کا ترجمہ شائع کرنا خلافِ اسلام سمجھا جاتا تھا۔ ان بزرگوں نے یہ روایت توڑی اور فارسی اور اُردو میں قرآنِ حکیم کے تراجم چھاپ دیے اور اس طرح خدا اور اس کے بندوں کے درمیان براہِ راست رابطہ پیدا کر دیا۔ شاہ صاحب کی اولاد نے غیر اسلامی رسوم اور روایات کے خلاف رائے عامہ منظم کرنے کی سعی فرمائی۔ رفتہ رفتہ سید احمد بریلوی کی قیادت میں ایک جماعتِ مجاہدین ابھری۔ جب اس میں کارکنوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہو گئی تو اس جماعت نے آزاد

قبائلی علاقے کو مرکز بنا کر شمالی مغربی ہند کی آزادی کے لیے مسلح جدوجہد کا آغاز کیا لیکن یہ جدوجہد ناکام رہی کیونکہ اسلامی مملکت کے کارکن تو واقعی تربیت یافتہ تھے لیکن عوام پر یہ نظام بغیر ذہن تیار کیے اوپر سے نافذ کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک حقیقی عوامی تائید سے محروم رہی۔ بہر حال مجاہدین کا ایک گروہ نصف صدی تک برطانوی سامراج کے دانت کھٹے کرتا رہا۔ اسی دوران میں ۱۸۵۷ کا انقلاب برپا ہوا۔ اس میں ایک تو وہ امرا اور حاکم پیش پیش تھے جو صرف اپنے اقتدار کی بحالی چاہتے تھے۔ دوسرے وہ عوام تھے جو انگریزی استحصال سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ تیسرے وہ علما اور مجاہدین شامل تھے جو ایک مثالی نظام کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ چونکہ یہ تین عناصر آپس میں گہرا تال میل نہ رکھ سکے اور نہ کوئی منصوبہ بندی موجود تھی اس لیے انقلاب ناکام رہا اور اس کے ساتھ ہی یہ نظریہ بھی باقی نہ رہا کہ سارے ہندوستان پر اسلامی اقتدار کا احیا عمل میں لایا جائے۔ اور اس کی جگہ ان مساعی کا آغاز ہوا جن کا منشا یہ تھا کہ برعظیم میں آباد مسلمانوں کے قومی تشخص کی حفاظت کا سامان فراہم کیا جائے۔ ان مساعی میں سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک پیش پیش تھی۔

علی گڑھ تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اقتدار چھن جانے سے مسلمانوں میں جو احساسِ کمتری پیدا ہو گیا اسے دور کیا جائے۔ ان میں خود اعتمادی کا جوہر پیدا کیا جائے تاکہ وہ آنے والے دور میں عزت کی زندگی بسر کر سکیں۔ چنانچہ سرسید نے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ بلند کیا۔ مسلمان عوام کو اسلاف کی روایات سے آگاہ کیا۔ انھیں جدید تعلیم کی طرف رغبت دلائی۔ تعصب کے بندھن توڑنے کی تلقین فرمائی لیکن سیاست سے الگ رکھا۔ کیونکہ ان کا اپنا ذہن اس بارے میں صاف نہیں تھا کہ سیاست ابھرے تو کس رنگ میں، اور مسلمان اس میں حصہ لیں تو کن مقاصد کے لیے؟ وہ اتنا جانتے تھے کہ جمہوری ادارے قائم ہوئے تو مسلمان ایک مستقل اقلیت بن کر اپنا تشخص کھو بیٹھیں گے کیونکہ ان کی آبادی صرف بیس فی صد تھی۔ اس لیے سرسید جمہوری اداروں کی مخالفت کرتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں اور انھوں نے بار بار اس کا برملا اظہار فرمایا لیکن ان کا ذہن یہ سوچنے سے قاصر تھا کہ مسلمانوں کا سیاسی مستقبل کیا ہو گا۔ چنانچہ انھوں نے ایک مرتبہ کہا:

"فرض کیجیے کہ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑے، تو اس صورت میں ہندوستان کے حاکم کون ہوں گے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ان حالات میں دو قومیں مسلمان اور ہندو ایک ہی تخت

پر بیٹھیں اور اقتدار میں برابر کی شریک ہوں۔ یقیناً نہیں۔ ضرورت یہ ہوگی کہ ان میں سے ایک دوسری کو فتح کرے اور اسے کچل کر رکھ دے۔ یہ اُمید کرنا کہ دونوں اقتدار میں برابر کی شریک ہوں، ناممکن الحد ناقابلِ تصور ہے۔"

گویا سرسید کے نزدیک دو ہی راستے تھے۔ ایک اقتدار میں برابر کی شرکت۔ دوسرا ایک قوم کا دوسری قوم پر تسلط۔ وہ پہلے راستے کو ناممکن تصور کرتے تھے اور دوسرے راستے کے خطرات سے آگاہ تھے۔

۱۹۰۶ میں آل انڈیا مسلم لیگ بنی تو تیسرا راستہ تجویز ہوا۔ یہ تھا جداگانہ انتخاب اور آئینی تحفظات کا راستہ۔ آگے چل کر اس نے قائداعظم کے چودہ نکات کا روپ دھار لیا جن کا ماحصل یہ تھا کہ برعظیم میں ایک وفاقی نظامِ حکومت قائم کیا جائے۔ صوبوں کو اندرونی خودمختاری دی جائے۔ مسلمانوں کے پانچ اکثریتی صوبوں اور ہندوؤں کے چھ اکثریتی صوبوں کے درمیان ایک توازن قائم ہو جائے۔ مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دی جائے۔ ہر صوبائی اور مرکزی وزارت میں مسلمانوں کی نمائندگی کم از کم ایک تہائی ضرور ہو۔ اور مسلمانوں کی ثقافت، تعلیم، زبان، دین، شخصی قوانین اور مخیر اداروں کو آئینی تحفظات دیے جائیں۔ گویا دونوں پر مشتمل ایک ایسا ملک وجود میں آجائے جس میں مسلمانوں کو اقتدار میں برابر کا نہیں، بلکہ ایک مؤثر شریک بنایا جائے۔

تیسرے راستے کے حصول کے لیے سیاسی عمل ایک تہائی صدی تک جاری رہا لیکن اس کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں کے قومی تشخص کی بحالی کے لیے ایک چوتھا راستہ بھی وقتاً فوقتاً تجویز ہوتا رہا اور وہ تھا، علیحدہ مملکت کے قیام کا راستہ۔ یہ راستہ سب سے پہلے عبدالحلیم شرر نے اپنے ہفت روزہ "تہذیب" میں ۱۸۹۰ میں تجویز کیا۔ ۱۹۱۳ میں محمد علی کے ہفت روزہ "کامریڈ" میں بھی اس کی طرف واضح اشارہ ہوا۔ ۱۹۱۷ میں اسٹاک ہلم کی بین الاقوامی سوشلسٹ کانفرنس میں خیری برادران نے یہی تجویز پیش کی اور ۱۹۲۱ میں آگرہ کے ایک شخص نادر علی نے اس موضوع پر ایک کتابچہ لکھا اور دلچسپی کی بات یہ ہے کہ بعض ہندو مفکرین اور سیاسیین نے بھی ایسے نظریات پیش کیے جن سے مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کے لیے ایک الگ مملکت کے قیام میں آسانی پیدا ہوگئی۔ ۱۹۲۵ میں ہندو مفکر لالہ ہردیال نے اپنی کتاب "میرے وچار" میں یہ نظریہ پیش کیا کہ سکھ اور جین اصلاً ہندو ہیں اور مسلمان، عیسائی اور

پارسی غیر ملکی باشندے ہیں۔ ان کے ساتھ اقتدار یا نظم و نسق میں شراکت ناممکن ہے، اس لیے یہ لوگ ہندوستان میں رہ تو سکتے ہیں لیکن انھیں حکومت میں کوئی عمل دخل حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس نے ایک چار نکاتی منصوبہ پیش کیا جس کے یہ اجزا تھے۔ اول سنگھٹن یعنی ہندوؤں کی الگ سیاسی تنظیم۔ دوم: ہندو راج سوم: شدھی یعنی مسلمانوں کو ہندو بنانا۔ چہارم: توسیع سلطنت یعنی ہندوستانی دفاع کو مضبوط کرنے کی خاطر افغانستان اور قبائلی علاقے پر قبضہ اور وہاں کے مسلمانوں کو ہندو مذہب قبول کرنے پر مجبور کرنا۔ ہر دیال کے برعکس ہندوستان کے نامور سیاست دان لالہ لاجپت رائے کا نقطۂ نگاہ حقیقت پسندانہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ اگر جداگانہ انتخاب اور مسلمانوں کی علیحدہ نیابت برقرار رکھنی ہے تو بہتر ہے کہ ہندوستان کا بٹوارہ ہو جائے۔ انھوں نے مسلمانوں کے لیے چار ریاستیں تجویز کیں۔ صوبہ سرحد، مغربی پنجاب، سندھ اور مشرقی بنگال۔

علامہ اقبال بھی علیحدہ مسلم مملکت کے بارے میں سوچ رہے تھے لیکن بڑی احتیاط سے چل رہے تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس میں مسلمانوں کے ان قومی مطالبات کی ترتیب میں نمایاں حصہ لیا جو بعد میں قائداعظم کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہوئے لیکن اسی سال انھوں نے ہندوؤں کا ردِ عمل معلوم کرنے کی خاطر مولانا مرتضیٰ احمد خاں سے "انقلاب" میں ایک سلسلۂ مقالات لکھوایا جن کا عنوان تھا "ہندی مسلمانوں کے لیے الگ وطن" اس پر بہت شور مچا لیکن مسلمان اخباروں نے اس کے حق میں لکھا۔ ۱۹۳۰ء کے اواخر میں اقبال نے محسوس کیا کہ جداگانہ انتخاب اور آئینی تحفظات کے ذریعے سے مسلمانوں کا قومی تشخص بحال نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انھوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں عملی قدم اٹھائے۔ اس کانفرنس میں صرف پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کے نمائندوں کو مدعو کیا گیا اور کانفرنس کے اشتہار میں اس خطے کو الگ ملک قرار دیا گیا۔ کانفرنس کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ اقبال کو آل انڈیا مسلم لیگ کے الہ آباد سیشن کی صدارت پیش ہوئی چنانچہ جس رائے کا اظہار کانفرنس میں ہونا تھا اس کے لیے مسلم لیگ کا پلیٹ فارم استعمال کر لیا گیا۔

خطبۂ الہ آباد میں مسلمانانِ ہند کے قومی تشخص کے سلسلے میں جو نظریات پیش کیے گئے ان کے نمایاں نقوش یہ تھے:

اوّل: اسلام اخلاقی نصب العین اور ایک خاص قسم کے نظامِ سیاست کا امتزاج ہے۔ اس نے

برعظیم کے مسلمانوں کی زندگی کو گہرے انداز میں متاثر کیا ہے اور انھیں ایسے بنیادی احساسات اور رُجحانات مہیا کی ہیں جن سے بکھرے ہوئے افراد اور گروہ ایک واضح اور معین قوم کا رُوپ لے لیتے ہیں۔ ہندوستان دنیا کا واحد خطہ ہے جہاں اسلام نے بہترین انداز میں تعمیرِ قوم کی قوت PEOPLE BUILDING FORCE کا کام دیا ہے۔

دوم: مَیں اس فرقہ وار گروپ سے پیار کرتا ہوں جو میری زندگی اور طرزِ عمل کا ماخذ ہے اور جس نے مجھے اپنا دین، اپنا ادب، اپنا فکر اور اپنی ثقافت دے کر مجھے وہ بنایا جو میں اس وقت ہوں۔ اور اس نے میرے موجودہ شعور میں اپنے پورے ماضی کی تخلیق نو ایک جیتا جاگتا اور حرکت پذیر عنصر بنا دیا۔

سوم: اسلام کا دینی نصب العین بنیادی طور پر اسلام کے معاشرتی نظام سے تعلق رکھتا ہے۔ ان میں سے ایک کو رد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دوسرا بھی رد کر دیا گیا ہے۔

چہارم: اس سرزمین میں ایک ثقافتی قوت کی حیثیت سے اسلام کی بقا کا دارومدار اسے ایک مخصوص علاقے میں مرتکز کرنے پر ہے۔ مَیں مطالبہ کرتا ہوں کہ ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفادات کے پیشِ نظر ایک مستحکم مسلم مملکت قائم کر دی جائے۔ اس سے ہندوستان میں طاقت کا اندرونی توازن، امن اور سلامتی کا پیامبر ہوگا اور اسلام کو موقع مل جائے گا کہ وہ اپنے قانون، اپنی تعلیم، اور اپنی ثقافت کو حرکت میں لائے اور انھیں اپنی اصل روح اور زمانہ حال کی روح کے قریب لے آئے۔

جہاں تک اسلام کو زمانہ حال کی روح کے قریب لانے کا تعلق تھا اقبال نے خطباتِ مدراس میں اس مسئلے پر مفصل بحث کی تھی اور یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ خلافت یا امامت کسی فرد میں نہیں، بلکہ عوام کے چُنے ہوئے نمائندوں میں مرتکز ہو سکتی ہے اور اجتہاد کے لیے اجماع کی جو ضرورت پیش آتی ہے وہ ایک منتخب شدہ قانون ساز اسمبلی سے پوری ہو سکتی ہے اور انھوں نے خطباتِ مدراس کے پیش لفظ میں اہلِ دانش سے اپیل کی کہ وہ پھیلتے ہوئے علم کے ساتھ ساتھ فکر کے نئے باب کھولیں۔ کیونکہ کوئی فلسفیانہ سوچ خاتمیت کی مظہر نہیں ہوتی۔

اسلام کے معاشی اور معاشرتی نظام میں اقبال نے اپنی رائے کا اظہار قائداعظم کے نام خطوط میں کیا۔ اس رائے کے نمایاں پہلو خود اقبال کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

۱۔ اسلامی قانون کے ایک طویل اور محتاط مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام

قانون کو صحیح طور پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کے لیے کم از کم قوت لایموت کا حق محفوظ ہو سکتا ہے۔ لیکن اسلامی شریعت کا نفاذ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہاں ایک آزاد اسلامی ریاست یا آزاد اسلامی ریاستیں وجود میں نہ آجائیں۔

۲۔ میرے ذہن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر ہندو مذہب سوشل ڈیماکریسی یا معاشری جمہوریت قبول کر لے تو اس کا اپنا وجود لازمی طور پر باقی نہیں رہے گا لیکن اگر اسلام اپنے قانونی اصول کے مطابق سوشل ڈیموکریسی کو کسی مناسب صورت میں قبول کرے تو وہ ایک انقلاب نہیں ہوگا، بلکہ اپنی اصل پاکیزگی کی طرف لوٹ آنے کے مترادف ہوگا۔

قائداعظم نے بھی اپنے خطبات میں جابجا بڑی وضاحت کے ساتھ کہا کہ پاکستان بنے گا تو اس میں قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں ایک ایسا عادلانہ نظام قائم ہوگا جو ہر قسم کے استحصال سے پاک ہوگا اور ایک غیر ملکی نامہ نگار سے انٹرویو کے دوران میں اس رائے کا بھی اظہار کیا کہ پاکستان میں بعض بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینا پڑے گا۔

میرے نزدیک وہ لوگ غلطی پر ہیں جو کہتے ہیں کہ تحریک پاکستان معاشرے کے ایسے مخصوص طبقات نے چلائی جو انگریز اور ہندو کی جگہ خود استحصال کرنا چاہتے تھے اور وہ لوگ بھی غلطی پر ہیں جو کہتے ہیں کہ مسلمان عوام کے ذہن میں کسی معاشی نظام کا خاکہ موجود نہیں تھا۔ اس سلسلے میں میں اس زمانے کے مشہور انگریزی اخبار نویس جناب فضل کریم خان دُرانی کی کتاب "پاکستان کا مطلب" مطبوعہ ۱۹۴۴ء سے یہ اقتباس پیش کرتا ہوں:۔

"عوام کے نزدیک پاکستان ایک ایسی مملکت ہوگا جس میں انسان ظلم، بے انصافی اور استحصال سے آزاد ہوں گے۔ جہاں نہ لالچ ہوگا نہ خود غرضی اور نہ افلاس کا خوف۔ اس مملکت میں وہ لوگ نہیں ہوں گے جو دوسروں کی محنت پر پلتے ہیں۔ یہاں ہر شخص سب کی بہبود اور خوشی کے لیے کام کرنے میں لذت محسوس کریں گے۔ یہاں دولت اور خاندانی وجاہت کو کوئی مراعات حاصل نہیں ہوں گی۔ افلاس ترقی میں حائل نہیں ہوگا۔ غریب سے غریب اور مفلس سے مفلس آدمی کا بیٹا اپنی صلاحیتوں کو جلا دینے اور تعلیم پانے کے مساوی حق کا مالک ہوگا۔ یہاں غربت، جہالت اور گندگی کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ کوئی شخص خالی پیٹ نہیں سوئے گا۔ چونکہ یہ ایک اسلامی مملکت ہوگی اس لیے شہری حقوق اور معاشی

فوائد میں مسلمان اور غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہیں ہوگا۔ اس مثالی مملکت کو عوام کی قوتِ متخیلہ نے ایک نیا نام دیا ہے۔ وہ اسے حکومتِ الٰہیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔" (صفحات ۱۵۹-۱۵۸)

اس مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شاہ ولی اللہ سے اقبال اور قائداعظم تک، ہمارے تمام رہنما مسلمانوں کے قومی تشخص کے تعین کے لیے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے ہمارا نصب العین یہ تھا کہ پورے برعظیم میں مسلمانوں کا اقتدار بحال ہو اور بعد میں جمہوری دور کے تقاضوں نے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ قومی تشخص کے لیے ایک مملکت حاصل کریں۔ لیکن قومی تشخص کی پوری جدوجہد کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا نظام وجود میں آئے جو عادلانہ ہو، منصفانہ ہو اور استحصال سے پاک ہو۔ گویا اصل مقصد تھا، بندگانِ خدا کی بھلائی۔

اساسیاتِ اسلام

از: مولانا محمد حنیف ندوی

اس دورِ تشکیک میں عالم اسلامی کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اسلام کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے موجودہ ارتقا کی روشنی میں کیونکر از سرِ نو مربوط اور استوار فکر کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ مولانا کی یہ کاوشِ علمی اسی اہم مسئلہ کے حل و کشود کو بہ احسن وجہ پورا کرتی ہے۔ اس میں اثبات باری، اسلام کے نظامِ حیات، ایمان بالآخرۃ اور اسلام کے اخلاقی نظام کے بارے میں سیرِ حاصل بحث کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کی پردہ کشائی بھی کی گئی ہے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا مفہوم کیا ہے۔ نظام حکومت کے متعلق اسلام کس نظریہ کا حامل ہے اور یہ کہ تقسیم دولت کے بارے میں اسلام کا تصورِ عدل کس اقتصادی ڈھانچے کا مقتضی ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں مذہب، فلسفہ، تصوف اور سائنس کے حقائق کو کامیابی کے ساتھ سمو کر بیان کیا ہے جس سے کتاب کی دلکشی اور معنویت میں بدرجہ غایت اضافہ ہوا ہے۔ اسلوبِ بیان غیر معذرت خواہانہ، علمی اور شگفتہ ہے۔ قیمت: بارہ روپے پچاس پیسے

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور